ڈاکٹر سید محمد یوسف

جبر و قدر

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے معمولی تجربے اور سادہ وجدان پر قناعت نہیں کرتا اور بجائے اس کے کہ عمل کی راہ پر آگے بڑھے، بیٹھے بیٹھے فطرت سے آنکھیں بند کر کے محض دماغی کاوش میں لگ جاتا ہے۔ نتیجہ میں خود اپنی پیدا کی ہوئی خیالی الجھنوں میں ایسا پھنستا ہے کہ رسیاں تڑانے کی ہر کوشش گرہوں کو اور مضبوط کرتی جاتی ہے۔ ایک عقلِ سلیم سے کام لینے والا انسان گورکھ دھندوں میں پڑنے سے انکار کرتا ہے اور فلسفہ کی ادھیڑ بن کو نہ صرف بیکار بلکہ صلاحیتوں کے لئے مضرت رساں قرار دیتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے اور سادہ عقل و وجدان کی بنیاد پر ایک نظام عمل تیار کرتا ہے۔ کیا ہم میں سے ہر ایک یہ نہیں جانتا کہ اس کا اپنا ایک وجود ہے، وہ اپنا جداگانہ احساس اور جداگانہ غور و فکر کی صلاحیت رکھتا ہے، اس کی اپنی ایک قوتِ ارادی بھی ہے۔ قوتِ ارادی کا عمل خارجی دنیا میں ہوتا ہے۔ خارجی دنیا ناپائیدار سہی لیکن ہے تو ایک ٹھوس حقیقت جو ہر لمحہ ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارے ارادوں کی تکمیل خارجی اسباب و علل کی محتاج ہے۔ جب کبھی خارجی اسباب و علل مہیا ہو جاتے ہیں تو انسان کو اپنی "قدرت" پر گھمنڈ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس کو خیال ہوتا ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ مسبب الاسباب کو بھولنے لگتا ہے۔ اپنے ارادوں کو کامیاب دیکھ کر اسے کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ سارے عالم کو اور خود اپنے آپ کو قادر مطلق کی قدرت اور ارادہ کا تابع مانے۔ اس کے برخلاف جب کبھی خارجی قوتیں اس کے ارادوں کے آگے زیر نہیں ہوتیں، جب کبھی وہ خود اپنے اوپر قابو پانے میں ناکام رہتا ہے تو عجز کا احساس انسان پر چھا جاتا ہے اور وہ اپنی ناکامیوں کا الزام سر سے اتار پھینکنے

کے لئے جبر کے نظریے میں پناہ لیتا ہے۔

قرآن انسان کو دونوں حقیقتیں یاد دلاتا ہے، اس کا عجز بھی اور اس کی اخلاقی ذمہ داری بھی۔ اسی سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ بے اعتدالی کی روک تھام بھی ہو جاتی ہے۔ انسان پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے کہ اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اپنے ماحول کو اپنے ارادوں کے مطابق تشکیل دے۔ صرف اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں اللہ کی توفیق شامل ہے۔ اللہ کی قدرت چونکہ تمام عالم کو محیط ہے اس لئے اگر اللہ چاہتا تو اسباب فراہم نہ ہو سکتے اور انسان کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو پاتے۔ گو انسان کو اخلاقی خود مختاری حاصل ہے تاہم انسان اور اس کا ارادہ دونوں خدا کی قدرت کے دائرہ سے خارج نہیں۔ ادنیٰ تأمل سے یہ بات صاف ہو جائیگی کہ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ دنیاوی نظام میں دیکھئے، افسر اور حاکم اپنے ماتحتوں کو بہت کچھ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل دے دیتے ہیں۔ لیکن ہر حال میں حاکم کی بالادستی اپنی جگہ قائم و برقرار رہتی ہے۔

قدرت کے ساتھ ساتھ علم بھی اللہ کی ایک لازمی صفت ہے۔ اللہ کو علم ہے کہ بندہ کیا کرے گا اور کیا نہیں کرے گا۔ اس کے علم میں کسی غلطی کا امکان نہیں۔ حوادث و واقعات کا اس کے علم پر پورا اترنا ضروری ہے۔ نیز اگر خدا چاہتا تو سارے انسانوں کو اپنی اطاعت اور نیکی پر مجبور کر دیتا لیکن اس نے اپنی حکمت سے ایسا نہیں کیا۔ ایک معلم اگر چاہے تو سارے طلبہ کو صحیح جوابات املاء کرا سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا اس لئے کہ اس کو امتحان مقصود ہے۔

ابتدائی دور میں مسلمان خدا کے علم و قدرت پر ایمان رکھتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی اخلاقی ذمہ داری کا بھی شدید احساس رکھتے تھے۔ وہ عمل میں مصروف رہتے تدبیر اور سعی و کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے لیکن آخری بھروسہ خدا کی توفیق پر کرتے۔ اسی کا نام تھا توکل یہ یقین کہ "اللّٰہُ مَعَنَا" اللہ ہمارے ساتھ ہے اور اللہ نے ہم سے کامرانی اور برتری عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ یقین ایک اہم جزو تھا اس عقیدۂ تقدیر کا جو بعد میں بے عملی کا بہانہ بنا اور کبھی جا اور کبھی بے جا مطعون ہوا۔ یہی یقین، یہی توکل علی اللہ، ابتدائی دور کے مسلمانوں کی غیر معمولی عملی سرگرمی کا سرچشمہ تھا۔

آگے چل کر وہ زمانہ آیا جب مسلمان پڑوسی قوموں کے فلسفہ سے واقف ہوئے۔ اس کے نتیجہ میں سب سے پہلے جبر و قدر کے مسئلہ میں قیل و قال شروع ہوئی۔ رسول اللہؐ نے سرے سے اس بحث میں پڑنے ہی سے منع فرمایا۔ لیکن فتح و کامرانی کے بعد جب مسلمانوں کو شکست اور مایوسی سے دوچار ہونا پڑا تو بے ہمتی اور لاچاری کی ذہنی کیفیت نے فکر و خیال کو اس طرف لگا ہی دیا۔ عوام الناس خدا کی عظمت پر زور دیتے اور شدت کے ساتھ کہتے کہ خدا قادر مطلق ہے جو چاہے کرے، بالفعل جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، بندے کی کیا مجال جو اس کے آگے اپنا ارادہ چلائے۔ یہ بات حقیقت سے کچھ بہت دور نہ تھی۔ اسی کا دوسرا رخ وہ تھا جس پر معتزلہ یعنی پڑھے لکھے، علمی انداز پر سمجھنے سمجھانے والے، زور دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ خدا کی قدرت اپنی جگہ، مگر اس کی ایک لازمی صفت عدل بھی تو ہے۔ اور عدل اس بات کو مستلزم ہے کہ انسان اپنے افعال میں پوری طرح آزاد ہو ورنہ ایک فعل پر مجبور کرنا اور پھر اس کی سزا یا جزا دینا دونوں ظلم ہے۔ مسلمانوں کے معاشرہ میں کچھ داخلی تغیرات اس قسم کے ہوئے کہ یہ بحث اور زیادہ پیچیدہ بن گئی۔ اس پر سیاست کا بھی سایہ پڑا۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ بنو امیہ نے خلافت کے بجائے سلطنت کا رنگ اختیار کیا اور رعایا کے ساتھ استبداد کا معاملہ کیا۔ اس کے نتیجہ میں ناراضگی عام تھی۔ اس ناراضگی کو اگر دلوں میں اندر ہی اندر دبایا جا سکتا تھا اور قابل برداشت بنایا جا سکتا تھا تو اسی طرح کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کی مرضی ہے۔ الغرض نظریۂ جبر کا سب سے تاریک پہلو یہی ہے کہ وہ ہر امر واقع کے سامنے، ہر قسم کے ظلم و جور کے آگے، نہ صرف انسان کو بے دست و پا بنا دیتا ہے بلکہ اس سے فکر و تدبیر کی قوتیں بھی سلب کر لیتا ہے۔ دراصل اختیار اور ارادہ کا انکار انسانیت کی نفی کے مترادف ہے۔ انسان اور غیر انسان میں یہی تو فرق ہے کہ انسان اپنے ارادہ سے خود اپنے اندر اور اپنے ماحول میں تبدیلی کر سکتا ہے، غیر انسان ارادہ اور تدبیر کی قوتوں سے محروم ہے۔ بقول اقبال:

منظر چمنستان کے زیبا ہوں کہ نازیبا ۔ محروم عمل نرگس مجبور تماشا ہے

اس کے برخلاف انسان کا یہ حال ہے:

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی ۔ یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

ایک مرتبہ جب توانائی اور فعالیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور معاشرہ میں شر اور فساد کی قوتیں زور پکڑ گئیں تو مسلمان ایک مدت تک اسی جبر و اختیار کی بحث میں الجھے رہے۔ اسی دوران میں کچھ ایسے عیسائی اور ہندوانہ نظریات بھی رائج ہوئے جن کی رو سے گریز اور بے عملی کے رجحانات کو تقویت پہنچی۔ رہبانیت کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ انسان تخلیق اور عمل کی قوتوں کو کچل دے، تمدنی روابط قطع کرے اور اجتماعی طور پر معاشرہ کے حالات میں تبدیلی و اصلاح کی کوئی کوشش یعنی جہاد نہ کرے۔ چنانچہ انہی غیر اسلامی نظریات سے متاثر ہو کر توکل کی تفسیریں کی جانے لگیں کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے، نہ تو کسب رزق کرے، نہ اجتماعی شر کی مقاومت میں کوئی حصہ لے بلکہ محض بے عملی اور غیر فطری تعذیب نفس میں انفرادی نجات کی راہ ڈھونڈے۔ بالآخر مسلمانوں نے جبر و اختیار کے درمیان صحیح راہ تو پا لی لیکن صرف نظری حد تک۔ تاریخ کے واقعات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقدام اور جرأت کی صفات بہت حد تک کھو چکے تھے اور انقلابی تبدیلیوں سے بڑی حد تک جھجک محسوس کرتے تھے۔ عباسی دور کے آخر میں جب نئی سادہ لوح قومیں اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئیں تب ہی کچھ نئی زندگی کے آثار نمودار ہوئے اور ایک مرتبہ پھر دین حق وسط ایشیا اور یورپ میں آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔

تقدیر بے شک برحق ہے لیکن ایک بات جو اس کے ساتھ ساتھ یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ تقدیر کا کسی کو علم نہیں۔ اگر ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے کہ تقدیر الٰہی کیا ہے تو یقیناً سعی و عمل کا کوئی محرک باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب تقدیر کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اور تقدیر کے امکانات لا انتہا ہیں تو پھر انسان اعلیٰ سے اعلیٰ امکان کو بروئے کار لانے کے لئے کیوں نہ تگ و دو کرے۔ خاص طور پر جب کہ یہ بتا دیا گیا کہ اللہ کی توفیق ہر شخص کی سعی و عمل کے مطابق ہوتی ہے۔ ایک مسلمان ماضی کی بابت تو یہ کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے کہ زمانہ جیسے جیسے گذرتا ہے تقدیرات حق ظاہر ہوتی ہیں اور لامحدود امکانات میں سے ایک امکان مخصوص اور متعین ہو کر واقعہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن مستقبل کی بابت کوئی وجہ نہیں کہ ایک مسلمان اپنے آپ کو امکانات میں سے کسی ایک مخصوص امکان کے سامنے لاچار و بے بس سمجھے۔ تقدیر حق نامعلوم ہونے کی وجہ سے ایک سادہ کاغذ کی طرح ہے۔ انسان اپنی استعداد کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ مقاصد

کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اگر طلب صادق اور سعی پرخلوص ہے تو وہی نقش ابھر آتے ہیں اور اس وقت یہ راز کھلتا ہے کہ تقدیر کیا تھی:

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

دینِ فطرت

مصنفہ:۔ مظہر الدین صدیقی

اسلام کو دین فطرت کہا جاتا ہے۔ دینِ فطرت سے کیا مراد ہے؟ اس کتاب میں قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ قیمت ۵۰ء۱ روپے

مسلم ثقافت ہندوستان میں

مصنفہ:۔ عبدالمجید سالکؒ

اس کتاب کی تالیف کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں نے برصغیر پاک و ہند کو گذشتہ ایک ہزار سال کی مدت میں کن برکات سے آشنا کیا اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا۔

صفحات ۵۳۰ ——— قیمت ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ

سیکرٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور